قدرت اللہ شہاب بہ حیثیت افسانہ نگار

مہتاب کرن، ریسرچ سکالر، ایم۔فل شعبۂ اُردو، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Qudratullah Shahab is considered one among the leading writers of Urdu literature. He has three collections of short stories (Nafsanay, Maan Ji and Surkh feeta). This article studies him as a short story writer.

قدرت اللہ شہاب (۱۹۱۹ء۔۱۹۸۶ء) کا شمار اردو ادب کے مایہ ناز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے جس کے متنوع پہلو ہیں۔ وہ ایک شہرت یافتہ ادیب، محبِّ وطن آفیسر، منکسر المزاج انسان، مذہب پرست اور صوفی ہیں۔ بحیثیت خودنوشت نگار بھی ان کی حیثیت مسلّمہ ہے۔ پہلے انڈین اور بعدازاں پاکستان سول سروس کے اہم ترین عہدوں پر فائز رہے۔ انہوں نے پاکستان کے تین سربراہوں یعنی گورنر جنرل غلام محمد، صدر سکندر مرزا اور جنرل ایوب خان کے ساتھ بطور سیکرٹری کام کیا۔ ان کی شخصیت کا جائزہ عملی زندگی کی کسی جہت سے بھی کیا جائے وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہی دکھائی دیتے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں ان کا مطالعہ بطور افسانہ نگار کیا جاتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب نے اپنے تخلیقی اور ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ انہوں نے ۱۹۳۸ء میں پہلا افسانہ ''چندراوتی'' لکھا۔ جس کا اعتراف وہ اپنی خودنوشت ''شہاب نامہ'' میں یوں کرتے ہیں کہ ''جب مزید چلنے کی سکت باقی نہ رہی تو مجبوراً میں گورنمنٹ کالج کے لان میں واپس آ گیا اور اپنا پہلا افسانہ لکھنے بیٹھ گیا افسانے کا عنوان ''چندراوتی تھا۔''[۱] ''چندراوتی'' اختر شیرانی کے ادبی رسالے ''رومان'' میں شائع ہوا۔ اسی طرح ان کا افسانہ ''پکے پکے آم'' جسے وزیر آغا نے ادب کی دُنیا میں ان کا پہلا قدم قرار دیا ہے، مولانا صلاح الدین احمد کے رسالے ''ادبی دُنیا'' میں شائع ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، پرتھوی ناتھ شرماء، آغا بابر، شمس آغا اور مسعود شاہد جیسے بڑے بڑے افسانہ نگار ادبی دُنیا پر راج کر رہے تھے لیکن مولانا صلاح الدین نے قدرت اللہ شہاب کے افسانے کو بے حد تحسین کی نظر سے دیکھا اور ایک نئے شہاب ثاقب کے طلوع ہونے کی نوید سنائی اور آنے والے وقت نے ان کے اس تجزیے کو درست ثابت کیا۔

قدرت اللہ شہاب کے تین افسانوی مجموعے ہیں۔ پہلا افسانوی مجموعہ ''نفسانے'' ۱۹۵۰ء میں منظرِ عام پر آیا جسے ''مکتبہ جدید لاہور'' نے شائع کیا۔ اس میں سولہ افسانے شامل ہیں مثلاً غریب خانہ، شلوار، جگ جگ، کٹی ہے رات تو، سب کا مالک، ماما، جال، آیا، تلاش، دورنگا، جلترنگ، ڈاگی، تین تارے، پہلی تنخواہ، صنم پلکیت اور سٹینو گرافر وغیرہ۔ دوسرا افسانوی مجموعہ ''ماں جی'' کے نام سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں شہاب کے صرف

افسانے ہی نہیں بلکہ خاکے، مکالمے، انشائیے، اور سفرنامے بھی شامل ہیں۔ مجموعے کی ترتیب کا یہ طریقہ اگرچہ ہماری مروجہ ادبی روایت سے ہٹ کر ہے مگر یہ افسانے خاکوں سے اور خاکے، مکالمے انشائیوں سے اور انشائیے سفرناموں سے پوری طرح مربوط ہیں۔ اس مجموعے کی تفصیل یوں ہے، ماں جی، ۱۸ سول لائنز، اقبال کی فریاد، آثار قدیمہ، اے بنی اسرائیل، ایک پنکچر، آپ بیتی، اور عائشہ آ گئی، غم جاناں، ریلوے جنکشن، سردار جسونت سنگھ، سرخ فیتہ، ایک ڈسپیچ، پکے پکے آم، پھوڑے والی ٹانگ، سٹینوگرافر، شلوار، چِگ چِگ، آیا، تلاش، دورنگا، جلترنگ، لے دے، کراچی اور پٹیالہ پیگ وغیرہ۔ تیسرا افسانوی مجموعہ ''سرخ فیتہ'' ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آیا جو دراصل نفسانے اور ماں جی میں شامل تمام افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کے شاہکار ''یاخدا'' کو بھی بعض ناقدین فن افسانہ قرار دیتے ہیں مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انوار احمد افسانے کے حوالے سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ''یاخدا'' پہلی بار ۱۹۴۸ء میں ''لاہور اکیڈمی'' سے شائع ہوا۔ اس میں تقسیم ہند کے بعد پاکستان آنے والے مہاجرین کی بے بسی و مظلومیت کا تذکرہ ملتا ہے۔

بحیثیت مجموعی شہاب کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد اگر انہیں عورت کے جسمانی اور جنسی استحصال کا نوحہ خواں افسانہ نگار قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ مرد کی نسبت عورت کے المیے کو نمایاں کرنے کی زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے افسانوں کے مرد کردار بھی فعال ہیں لیکن ان کی ساری کی ساری مردانگی تکمیل ذات اور ہوس پرستی کی نذر ہو جاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت ہر مقام پر مرد کی ہوس پرستی کا شکار ہوتی ہے۔ اس کی نمایاں مثال ''یاخدا'' کی دلشاد ہے۔ جسے سکھوں نے فسادات کے دوران مسجد میں بند کیے رکھا اور اپنی ہوس کا نشانہ بناتے رہے اس طرح وہ اپنی دانست میں سترہ سو سالہ اذانوں اور نمازوں کا بدلہ لے رہے تھے۔ پاکستان آتے ہوئے وہ اپنی بے بسی کی نشانی اپنی بیٹی کی صورت میں لائی۔ یہاں آ کر اسے امریک سنگھ اور ترلوچن سنگھ کی بجائے مسلم بھائیوں (انور اور رشید) وغیرہ کی زیادتیوں کا شکار ہونا پڑا۔ ''پکے پکے آم''، ''آیا''، ''ریلوے جنکشن'' اور ''تین تارے'' جیسے افسانوں میں عورت کے جنسی اور جذباتی استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ''دورنگا'' میں اس طبقے کی نشاندہی کی گئی ہے جو ترقی کے لیے بیویوں کو بطور زینہ استعمال کرتے ہیں۔ ''ماما''، ''سٹینوگرافر'' اور ''نمبر پلیز'' میں ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانہ ''تلاش'' سے ''ایک'' اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

> ''ایک دن وہ گوراں کے چوبارے میں گیا۔ اس کی جیب آسودہ تھی۔ اس نے ایک ایک روپے کے بیس نوٹ گوراں کے سامنے بچھا دیئے گوراں نے کہا! ''آپ یہ نوٹ اپنے ہی پاس رکھیں۔ آپ میری قیمت نہیں دے سکتے۔'' ظہیر نے سوچا وہ بَن رہی ہے۔ اس نے گوراں کو اسی قیمت میں چکایا تھا۔ اس نے اپنا بٹوا نکال کر ہوا میں اچھالا اور فخر سے بولا ''مانگو کیا مانگتی ہو جان تمنا آج تمہارا ظہیر خوشحال ہے۔'' گوراں نے ایک تھکی ہوئی انگڑائی لی ''ظہیر صاحب میں روز روپیہ کماتی

ہوں آپ روز روپیہ لٹاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ آج ایک لمحہ کے لیے آپ گاہک نہ بنیں۔ ایک مرد بن جائیں۔ آپ مجھے گوراں نہ سمجھیں۔ ایک عورت سمجھیں بس یہ دو بے لوث لمحے میری حیات کو جاوید کر دیں گے۔''[۲]

قدرت اللہ شہاب نے اپنے افسانوں میں قحط بنگال اور اس سے پیدا ہونے والی صورتحال کی عکاسی نہایت موثر انداز میں کی ہے۔ وہ اس وقت بنگال میں بطور آئی۔سی۔ایس تعینات تھے اور تمام صورتحال کا مشاہدہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے براہِ راست کیا۔ ان کے پاس ایک افسانہ نگار کا تخیل اور ایک سرکاری آفیسر کی حیثیت سے براہ راست معلومات تھیں۔ لہٰذا انہوں نے اپنے افسانوں میں صرف قحط سے پیدا ہونے والی غربت، افلاس اور بھوک کو موضوع ہی نہیں بنایا بلکہ وہ سرکاری کارندوں کی بے حسی اور ناجائز منافع خوروں کے غیر انسانی رویے کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ مثلاً ''غریب خانہ'' کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے!

''شاید یہی وجہ تھی کہ رات کے وقت جب سسکتے ہوئے، گھبراتے ہوئے انسانی ڈھانچے زندگی کے لق ودق صحرا میں آخری کنارے کا کھوج لگانے کے لیے تڑپنے لگتے تو جب ننھے ننھے بچے خواب میں اپنے مرے ہوئے ماں باپ کی جھنجھاتی ہوئی کھوپڑیاں دیکھ کر چیخ چیخ اٹھے تو اس وقت یکا یک سپرنٹنڈنٹ صاحب کو اپنے ادھورے رجسٹر کا فارم پر کرنا یاد آتا اور وہ بینا کو اپنے دفتر میں بلوا لیتے۔۔۔اسی طرح غریب خانے کی بہت سی بیناؤں، بسنتیوں اور شامولیوں نے اپنے اپنے سہارے کی لڑایاں تھام رکھی تھیں اور ان کی زندگی کے چور دروازوں سے ابلی ہوئی دال اور چاول کے ساتھ ساتھ نئی نئی دھوتیاں، صابن کی ٹکیاں اور گلوکوز ڈی کی مٹھاس بھی رس رس کر آنے لگی تھی۔''[۳]

''سب کا مالک'' میں بھوک سے ستائے ہوئے دیہاتی جب چاول کی تلاش میں کلکتہ پہنچتے ہیں تو وہاں کی سڑکوں پر انہیں زندگی اپنی بھیانک شکل میں دکھائی دیتی ہے کلکتہ جوان کی امیدوں کا کعبہ تھا جہاں کتوں کو گوشت ملتا تھا اور بلیاں دودھ پیتی تھیں وہاں چاول بھی تو دستیاب ہوں گے۔

شہاب کے افسانوں کی ایک خاصیت یہ ہے کہ ان کے زیادہ تر افسانوں کا خمیر سرزمینِ کشمیر سے ابھرتا ہے۔ انہوں نے وہاں کے ماحول کی ایسی جھلک پیش کی ہے جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کردار اور واقعات ایک دوسرے میں جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ موضوع نیا نہیں ااس پر کرشن چندر، پریم ناتھ پردیش، شمس آغا اور ٹھاکر پونچھی جیسے قلمکاروں نے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ شہاب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایسے کرداروں کو ہمارے سامنے پیش کیا جن سے ان کی زندگی سے بھرپور تصویریں مرتب ہوتی ہیں۔ شہاب کا افسانہ ''پھوڑے والی ٹانگ'' اس کی بہترین مثال ہے۔ دراصل قدرت اللہ شہاب کے افسانوں میں کشمیر سے وابستگی کی وجہ یہ ہے کہ ان کا بچپن کشمیر میں گزرا اس لیے ان کے ہاں کشمیر اور وہاں کے ماحول کی عکاسی نمایاں ہے۔ کشمیر کی غربت و افلاس ان کا خاص موضوع ہے۔ ''دورنگا'' ظاہر و باطن کے تضاد سے تخلیق کیا گیا کشمیری ڈوگرہ ریاست کا

ایک مخصوص کردار ہے۔ جیسے شہاب نے بڑی بیباکی سے موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں کشمیر کے حسین مرغزاروں، ڈل جھیل، زاعفران کے کھیتوں اور حسین ڈوگریوں کا ذکر بار بار ملتا ہے۔

شہاب نے منٹو کے اثرات بھی قبول کیے ہیں مثلاً ''تین تارے''، ''تلاش'' اور ''آیا'' کا بے باک لہجہ اور طنز کے نشتر ہمیں منٹو کی یاد دلاتے ہیں شہاب کا طنزیہ انداز ان کے بیشتر افسانوں میں تلوار کی ضرب کا کام دیتا ہے۔ اور خاص طور پر جب وہ زندگی کے کج رویّوں پر طنز کے تیر چلاتے ہیں اور مذہبی منافقوں اور ریاکاریوں کا پردہ چاک کرتے ہیں تو وہیں زندگی کی رنگارنگی اور متنوع جہاں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں، جس سے ان کے افسانوں میں نئی جہتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ''ماں جی'' میں وہ حقائق پر پردہ ڈالنے کی بجائے ایک معصوم بچے کی طرح بادشاہ سلامت کو ننگا کہنے کی جرأت کر رہے ہیں۔ ''نمبر پلیز'' کی زوبی اندھیرے غار میں گرتی جاتی ہے جہاں کوئی فرشتہ وحی لے کر نازل نہیں ہوتا کیونکہ عورتوں پر وحی کا نزول تقاضائے خداوندی کے خلاف ہے۔ اسی طرح ''جگ جگ'' بنی نوع انسان کی مشترکہ جائیداد ہے۔ وہ کسی کی ماں نہیں، کسی کی بہن نہیں اور کسی کی بیوی نہیں ہے۔ قدرت اللہ شہاب کی زندگی کے بعض پہلو اسرار میں ڈوبے ہوئے ہیں جن پر وہ کبھی چاک نہیں ہوتا یہی پراسرائیت ہمیں ان کے بعض افسانوں میں بھی دکھائی دیتی ہے مثلاً ''۱۸ سول لائنز'' کی طلسمی فضا ان کی شخصیت کی طرح پُر اَسرار ہے۔ قدرت اللہ شہاب نے اپنے افسانوں میں دلچسپ اور جیتے جاگتے کرداروں کی تخلیق سے معاشرتی برائیوں کو اجاگر کیا ہے۔ وہ کردار کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے اس کے باطن میں جھانکتے ہیں اور اس کی حقیقت قاری کے سامنے کھل کر پیش کرتے ہیں۔ ''یا خدا'' میں دلشاد کا کردار جاندار ہے دلشاد اپنوں اور بیگانوں کے رویوں سے اس قدر تنگ آ جاتی ہے کہ تباہی و بربادی کی تصور ہی ختم ہو جاتا ہے۔ نیک طنیت کردار جب ناقص صورتحال سے دوچار ہوتا ہے تو کس طرح انسانیت کی فطرت بدل جاتی ہے۔ اس کی ایک جھلک ہمیں ''اور عائشہ آ گئی'' میں نظر آتی ہے۔ ''سٹینوگرافر'' کی ''گریسی'' اور ''نمبر پلیز'' کی ''زوبی'' ایسے کردار ہیں جو نفرت، بغاوت اور انتقامی جذبے کی بنیاد پر خود سپردگی جیسے فعل پر تیار ہو جاتے ہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ قدرت اللہ کے افسانوں کے کردار حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور زندگی کے مختلف المناک گوشوں کو اجاگر کرتے ہیں بقول انور سدید ''ان کے کردار ان کی دنیا کے حقیقی کردار ہیں اور ان کے ساتھ شہاب نے اپنی زندگی کا سنہری دور گزارا ہے چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ انہوں نے زندگی کو حرف ضمیر کا عملی یا تخلیقی نمونہ بنا کر پیش نہیں کیا بلکہ زندگی کو نیکی اور برائی کی آماجگاہ قرار دیا۔''[۴] قول و فعل کا تضاد ہمارے معاشرے کا وہ ناسور ہے جو کسی زمانے میں بھی ختم نہیں ہوا۔ اسی موضوع پر شہاب کا افسانہ ''اور عائشہ آ گئی'' ہے اس میں عبدالکریم جیسے ریاکار لوگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا بحث کے بعد یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قدرت اللہ شہاب کے افسانے اُردو ادب کا بیش بہا خزانہ ہیں۔ ان کے ہاں انشا کے اعلیٰ درجے کے نمونے ملتے ہیں۔ جس واقعہ کو بیان کرتے ہیں اس کی تمام جزئیات بھی فراہم کرتے ہیں۔ معمولی واقعہ کو غیر معمولی بنا کر پیش کرنا شہاب کا کمال ہے۔ معمولی واقعہ بیان کرتے ہوئے

ایسے نکتے تلاش کرتے ہیں کہ غیر اہم معلومات بھی نمایاں حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ ان کے افسانے ایک نئی اخلاقی تہہ داری کا احساس دلاتے ہیں۔ وہ واعظ و نصیحت کی کیفیت پیدا نہیں کرتے بلکہ ان میں زکاوت اور شگفتگی کا تاثر ابھارتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کہانی کا پلاٹ اور کردار نمایاں حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ پلاٹ قاری کے جذباتی اتار چڑھاؤ کو نمایاں کرتا ہے جبکہ کردار، پلاٹ میں نہ صرف حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ جمود کو ختم کر کے زندگی میں حرارت و حرکت کے عناصر پیدا کرتا ہے۔ شہاب کے پلاٹ، واقعات اور نظم و توازن پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر نگہت ریحانہ کہنا ہے کہ:

> ''قدرت اللہ شہاب کے پلاٹ منظّم ہوتے ہیں۔ واقعات کے بیان میں آغاز، وسط اور انجام میں مرکزی وحدت پیدا کرتے۔ جس سے ابتداء سے اختتام تک ایک ترتیب نظم و توازن اور تناسب کا احساس ہوتا ہے اسی لیے ان کے مفہوم بھی واضح ہوتے ہیں۔ انہوں نے مخصوص تہذیبی معاشرت کی عکاسی میں تصنّع سے پاک زندگی کے پس منظر میں انسان کی فطری سادگی اور حالات سے مجبور ہو کر اپنائی گئی ریاکاری اور فریب کو پیش کیا ہے۔''[۵]

شہاب کا افسانوی ادب بے باک حقیقت نگاری کا ترجمان ہے یہی حقیقت پرستی ان کے مزاج کا حصہ تھی اسی لیے انہوں نے جو کچھ دیکھا بے خوف و فکر ہو کر لکھا۔ انہوں نے افسانوی ادب میں اپنی انفرادیت کو تسلیم کروایا۔ شہاب نے متنوع، مصروف اور ہنگامہ خیز زندگی گزاری۔ پاکستانی انتظامیہ کے اہم عہدوں اور رائٹرز گلڈ کی تشکیل میں پیش پیش رہے۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود وہ اُردو ادب کا دامن افسانہ نگاری سے مالا مال کرتے رہے۔ اگرچہ شہاب کی نمود اس وقت ہوئی تھی جب آسمان ادب پر بڑے بڑے ستارے روشن تھے لیکن شہاب اپنی انفرادی سوچ اور مخصوص نقطہ نظر ہونے کے باوجود سب سے الگ محسوس ہوتے ہیں اس کا ایک سبب ان کا طنزیہ انداز ہے اس سلسلے میں مرزا ادیب کا کہنا ہے کہ:

> ''اس کی تحریر میں ایک دبی دبی طنزیہ تشریت پڑھنے والوں کی رگ احساس کو زخماتی رہتی تھی۔ اس کے افسانہ درحقیقت ''نفسانے'' ہوتے تھے جن میں نفسیاتی تلخیاں زہر آلود طنز کے ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔۔۔ مزاح نگار ایک ہنسانے والا شخص ہوتا ہے اور طنز نگار بھی ہنساتا ہے لیکن وہ اپنے قارئین کو جس قسم کی ہنسی دیتا ہے اس میں کرب کا زہر چھپا ہوتا ہے شہاب طنز نگار تھے اور اپنی نوعیت کے واحد اُردو افسانہ نگار تھے۔''[۶]

افسانوں کے علاوہ شہاب کا تخلیقی کارنامہ ''شہاب نامہ'' اگرچہ آپ بیتی ہے لیکن اس کا انداز اور اسلوب بھی افسانوی ہے الغرض قدرت اللہ شہاب کی تخلیقی نگارشات کا جس جہت سے بھی مطالعہ کیا جائے وہ ہر لحاظ سے خود افسانہ اور افسانہ نگار ہی دکھائی دیتے ہیں، افسانوی ادب میں یہی ان کی عظمت کا راز ہے اور شہرت دوام کا ذریعہ بھی۔

حواشی:

۱۔ قدرت اللہ شہاب، ''شہاب نامہ''، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء)، ص: ۸۹
۲۔ قدرت اللہ شہاب، ''ماں جی''، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء)، ص: ۱۷۹
۳۔ قدرت اللہ شہاب، ''نفسانے''، (لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۰ء)، ص: ۲۶۔۲۷
۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اُردو افسانے کی کروٹیں''، (لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء)، ص: ۱۲۹
۵۔ نگہت ریحانہ خاں، ڈاکٹر، ''اُردو مختصر افسانہ۔ مختصر فنی تکمیل مطالعہ''، (لاہور: میاں چیمبرز، ۳ ٹمپل روڈ، ۱۹۸۸ء (باراوّل))، ص: ۱۴۵
۶۔ ''ذکر شہاب (یادنامہ قدرت اللہ شہاب مرحوم)''، مضمون (قدرت اللہ شہاب: صرف چند جھلکیاں)، مرتبہ: سنگ میل پبلی کیشنز لاہور: ۲۰۰۶ء، ص: ۵۵

مآخذ:

۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اُردو افسانے کی کروٹیں''، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء۔
۲۔ قدرت اللہ شہاب، ''نفسانے''، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۰ء۔
۳۔ قدرت اللہ شہاب، ''شہاب نامہ''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء۔
۴۔ قدرت اللہ شہاب، ''ماں جی''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء۔
۵۔ نگہت ریحانہ خاں، ڈاکٹر، ''اُردو مختصر افسانہ۔ مختصر فنی تکمیل مطالعہ''، لاہور: میاں چیمبرز، ۳ ٹمپل روڈ، ۱۹۸۸ء (باراوّل)۔

☆☆☆